

گئی تھیں، اور علماء برحق بھی جن سے مداخلت کر رہے تھے، ابن تیمیہ نے انکو ٹھیکہ اسلام کے منافی پایا اور انکی پرزور مخالفت کی۔ اس آزاد خیالی و صاف گوئی کی وجہ سے ایک دنیا انکی دشمن ہو گئی اور کج تنگ دشمن چلی آتی ہے۔ جو لوگ ان کے عہد میں تھے انہوں نے مقدمات قائم کر کے کئی بار جیل بھجوا دیا اور جو بعد میں آئے انہوں نے تکفیر و تضلیل کر کے اپنا دل ٹھنڈا کیا۔ مگر اسلام خالص و محض کے اتباع کا جو صورت اس شخص نے چھوڑا تھا اسکی بدولت ایک مستقل حرکت دنیا میں پیدا ہو گئی جسکی آواز باز گشت اب تک بلند ہو رہی ہے۔

اس تجدیدی کام کے ساتھ انہوں نے تاری و حشت و بربریت کے مقابلہ میں تلوار سے بھی جہاد کیا۔ اس وقت مصر و شام اس سیلاب بچے ہوئے تھے۔ امام نے وہاں کے عام مسلمانوں اور رئیسوں میں غیرت و حمیت کی آگ پھونکی اور انہیں مقابلہ پر آمادہ کیا۔ انکے ہم عصر شہادت دیتے ہیں کہ مسلمان تاتاریوں کے اتنے مرعوب و بے چکے تھے کہ ان کا نام سن کر کانپ اٹھتے تھے اور ان کے مقابلہ میں جاتے ہوئے یوں ڈرتے تھے کہ انما یساقون الی الموت۔ مگر ابن تیمیہ نے ان میں جہاد کا جوش پھونک کر شجاعت کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کر دیا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ بھی کوئی ایسی سیاسی تحریک نہ اٹھا سکے جس سے نظام حکومت میں انقلاب برپا ہوتا اور اقتدار کی کنجیاں جاہلیت کے قبضہ سے نکل کر اسلام ہاتھ میں آئیں۔

شیخ احمد سرہندی

ساتویں صدی میں فتنہ تاتار نے ہندو کش سے اُس پار کی دنیا کو تو بالکل تاخت و تاراج کر دیا مگر ہندوستان اسکی دست برد سے بچ گیا تھا۔ اس ڈھیل نے یہاں کے مترفین کو اسی غلط فہمی میں ڈال دیا جو ہمیشہ فریفتگانِ زینتِ دنیا کو لاحق ہوتی ہے۔ یہاں وہ تمام خرابیاں پرورش پاتی رہیں جو خراسان و عراق میں تھیں۔ وہی پادشاہوں کی خداوندی، وہی امرار و اہل دولت کی عیش پسندی، وہی باطل راستوں سے مال لینا اور باطل راستوں میں خرچ کرنا، وہی جبر و ظلم کی حکومت، وہی خدا سے

غفلت اور دین کی مراد مستقیم سے بُعد۔ رفتہ رفتہ نوبت اکبر بادشاہ کے دور حکومت تک پہنچی جس میں گمراہیاں اپنی حد کو پہنچ گئیں۔

اکبر کے دربار میں یہ رائے عام تھی کہ ملت اسلام جاہل بدودوں میں پیدا ہوئی تھی، کسی مہذب و شائستہ قوم کے لیے وہ موزوں نہیں۔ بنوت، وحی، حشر و نشر، دوزخ و جنت، ہر چیز کا مذاق اڑانا جانے لگا۔ قرآن کا کلام الہی ہونا مشتبہ، وحی کا نزول عقلاً مستبعد، مرنے کے بعد ثواب و عذاب غیر یقینی، البتہ تنازع ہر آئینہ ممکن و اقرب الی الصواب۔ معراج کو علانیہ محال قرار دیا جاتا۔ ذات نبوی پر اعتراضات کیے جاتے، خصوصاً آپ کی ازواج کے تعدد پر اور آپ کے عزوات و سراپا پر۔ یہاں تک کہ لفظ احمد اور محمد سے بھی بیزاری ہو گئی اور جیکے ناموں میں یہ لفظ شامل تھا انکے نام بدلے جاتے۔ دنیا پرست علمائے اپنی کتابوں کے خطبوں میں نعت لکھتی چھوڑ دی۔ بعض ظالم اس حد تک بڑھے کہ دجال کی نشانیاں ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں کرنے لگے، الیہا ذبا اللہ، الیہا ذبا اللہ۔ دیوان شامی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ نماز ادا کر سکے۔ ابوالفضل نے نماز، روزہ، حج اور دوسرے شعائر دینی پر سخت اعتراضات کیے اور ان کا مذاق اڑایا۔ شعرا نے ان شعائر کی محجولکھی جو عوام کی زبانوں تک بھی پہنچی۔

بہائی نظریہ کی بنا بھی دراصل اکبری عہد ہی میں پڑی تھی۔ اُس وقت یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر ایک ہزار سال گزر چکے ہیں اور اس دین کی مدت ایک ہزار سال ہی تھی، اسیلے اب منسوخ ہو گیا اور اسکی جگہ نئے دین کی ضرورت ہے۔ اس نظریہ کو سکوں کے ذریعہ سے پھیلا یا گیا کیونکہ اس زمانہ میں نشر و اشاعت کا سب سے زیادہ قوی ذریعہ یہی تھا۔ اسکے بعد ایک نئے دین اور نئی شریعت کی طرح ڈالی گئی جسکا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب کو مل کر ایک مخلوط مذہب بنا یا جائے تاکہ شاہی حکومت مستحکم ہو۔ دربار کے خوشامدی ہندوؤں نے اپنے بزرگوں کی طرف سے اس قسم کی پیشینگوئی

سنائی شروع کر دیں کہ فلاں زمانہ میں ایک گنور کھشک مہا تہا بادشاہ پیدا ہو گا۔ اور اسی طرح بندہ زر علمار نے بھی اکبر کو مہدی اور صاحب زمان اور امام مجتہد وغیرہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ایک ”تلج العافین“ صاحب یہاں تک بڑھے کہ اکبر کو انسان کامل اور خلیفۃ الزماں ہونے کی حیثیت خدا کا عکس ہی پھیرا۔ عوام کو سمجھانے کے لیے کہا گیا کہ حق اور صدق (عالمگیر سچائیاں) تمام مذاہب میں موجود ہیں، کوئی ایک ہی دین حق کا احارہ دار نہیں ہے، لہذا سب مذاہبوں میں جو جو باتیں حق ہیں انہیں لے کر ایک جامع طریقہ بنا چاہیے اور اسکی طرف لوگوں کو دعوت عام دینی چاہیے تاکہ ملتوں کے سب اختلافات مٹ جائیں، اسی طریق جامع کا نام دین الہی ہے۔“ اس نئے دین کا کلمہ لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ بتویر کیا گیا۔ جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے انکو ”دین اسلام مجازی و تقلیدی“ کہ از پدراں دیدہ و شنیدہ ام“ سے تو بہ کر کے ”دین الہی اکبر شامی“ میں داخل ہونا پڑتا تھا، اور داخل ہونے کے بعد ان کو لفظ ”چیلہ“ سے تعبیر کیا جاتا۔ سلام کا طریقہ بدل کر یوں کر دیا گیا کہ سلام کرنے والا ”اللہ اکبر“ اور جواب دینے والا جل جلالہ کہتا (یا درہے کہ اکبر کا نام جلال الدین تھا)۔ چیلوں کو بادشاہ کی تصویر دی جاتی اور وہ اسے پگڑی میں لگاتے۔ بادشاہ پرستی اس دین کے ارکان میں سے ایک رکن تھی۔ ہر روز صبح کو بادشاہ کا درشن کیا جاتا، اور بادشاہ کے سامنے جب حاضری کا شرف عطا ہوتا تو اسکے سامنے سجدہ بجالایا جاتا۔ علما کرام اور صوفیان باصفا، دونوں اپنے اس قبلہ حاجات و کعبہ مرادات کو بے تکلف سجدہ فرماتے تھے اور اس صریح شرک کو ”سجدہ تحیہ“ اور ”زمین بوسی“ جیسے الفاظ کے پردے میں چھپاتے تھے۔ یہ وہی ملعون حیلہ بازی تھی جسکی پیشین گوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب لوگ حرام چیز کا نام بدل کر اسکو حلال کر لیا کریں گے۔

اس نئے دین کی بنا تو یہ کہہ کر رکھی گئی تھی کہ اس میں بلا کسی تعصب کے ہر مذہب کی اچھی باتیں لی جائیں گی، مگر دراصل اس میں اسلام کے سوا ہر مذہب کی پذیرائی تھی اور نفرت و عداوت کے لیے صرف اسلام

اور اسکے احکام و قوانین ہی کو مختص کر لیا گیا تھا۔ پارسیوں کے آتش پرستی لی گئی، اکبری محل میں دائمی آگ کا لاؤ روشن کیا گیا اور چراغ روشن کرنے کے وقت قیامِ تعظیمی کیا جانے لگا۔ عیسائیوں سے ناقوس نوازی اور گائے صورتِ ثالث ثلاثہ اور افسیسم کی چند چیزیں لی گئیں۔ سب سے زیادہ نظر عنایت ہندو بیت پر تھی کیونکہ یہ ملک کی اکثر آبادی کا مذہب تھا اور پادشاہی کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے اسکی استمالت ضروری تھی۔ چنانچہ گائے کا گوشت حرام کیا گیا۔ ہندو تھوار، دیوالی، دسہرہ، راکھی پونم، شیورا تری وغیرہ پوری ہندوانہ رسوم کے ساتھ منائے جانے لگے۔ شاہی محل میں عہون کی رسم ادا کی جانے لگی۔ دن میں چار وقت آفتاب کی عبادت کی جاتی اور آفتاب کے ایک ہزار ایک ناموں کا پ کیا جاتا۔ آفتاب کا نام جب زبان پر آتا تو جلّتِ قدرت کے الفاظ کہے جاتے۔ پیشانی پر تشقہ لگایا جاتا۔ دوش و مکھ پر جینیوڈالاجاتا اور گائے کی تعظیم کی جاتی۔ معاذ متعلق عقیدہ تنازع تسلیم کر لیا گیا اور برہمنوں کے دوسرے بہت سے اعتقادات سیکھے گئے۔ یہ سارے معاملے تو تھا دوسرے مذاہب کے ساتھ۔ رہا اسلام تو اسکے معاملہ میں بادشاہ اور درباریوں کی ایک ایک حرکت سرِ ظاہر ہوتا تھا کہ انکو اس سے ضد اور چڑ ہو گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے خلاف دوسرے مذاہب والوں کی طرف سے جو بات دربار کا رنگ دیکھ کر ذرا فلسفیانہ و صوفیانہ انداز میں پیش کر دی جاتی اسے وحیِ آسمانی سمجھ کر قبول کر لیا جاتا اور اسکے مقابلہ میں اسلامی تعلیم ذکر و عبادت کی۔ علماء اسلام اگر اسلام کی طرف سے کوئی بات کہتے، یا کسی گمراہی کی مخالفت کرتے تو انہیں ”فقیر“ کے نام سے موسوم کیا جاتا جسکے معنی اُگلی اصطلاح خاص میں احمق اور ناقابلِ انتفاع آدمی کے ہو گئے تھے۔ چالیس آدمیوں کی ایک کمیٹی مذاہب کی تحقیق کے لیے مقرر کی گئی تھی جس میں تمام مذاہب کا مطالعہ بڑی رواداری بلکہ عقیدہ مندی کے ساتھ کیا جاتا تھا، مگر اسلام کا نام آتے ہی اسکا مذاق اڑایا جانے لگتا تھا اور اگر اسلام کا کوئی حامی جواب دینا چاہتا تو اسکی زبان بند کر دی جاتی تھی۔ یہ برتاؤ اسی حد تک نہ رہا بلکہ عملاً اسلام کے احکام میں دل کھول کر ترسیم و تشبیح کی گئی۔ سودا جوے اور شراب کو حلال کیا گیا۔ شاہی مجلس میں نوروز کے موقع پر

شراب کا استعمال ضروری تھا حتیٰ کہ قاضی مفتی تک پی جاتے تھے۔ ڈاڑھی منڈوانے کا فیشن عام کیا گیا اور اسکے جواز پر دلائل قائم کیے گئے۔ چچا زاد اور ماموں زاد بہن سے نکاح کو ممنوع ٹھہرایا گیا۔ لڑکے کے لیے ۱۶ سال اور لڑکی کے لیے ۱۴ سال کی عمر نکاح مقرر کی گئی۔ ایک بیوی سے زیادہ بیویاں رکھنے کی ممانعت کی گئی۔ حد زنا نہ صرف موقوف کی گئی بلکہ چند ضوابط کے ساتھ زنا کو قانوناً جائز ٹھہرایا گیا۔ ۱۲ سال کی عمر سے پہلے ختنہ کی ممانعت کر دی گئی۔ ریشم اور سونے کے استعمال کو حلال کیا گیا۔ شیر اور بھیر ٹیے کو حلال کیا گیا۔ سور کو اسلام کی ضد میں نہ صرف پاک بلکہ ایک مقدس جانور قرار دیا گیا، حتیٰ کہ صبح آنکھ کھولتے ہی اسکو دیکھنا مبارک خیال کیا جاتا تھا۔ مُردوں کو دفن کر نیلے بجائے جلانا یا پانی میں بہانا احسن ٹھہرایا گیا، اور اگر کوئی دفن ہی کرنا چاہے تو سفارش کی گئی کہ پاؤں قبلہ کی طرف رکھے جائیں۔ اکبر خود اسلام کی ضد میں قبلہ ہی کی طرف پاؤں کر کے سونے کا التزام کرتا تھا۔ حکومت کی تعلیمی پالیسی بھی سراسر اسلام کی مخالف تھی۔ عربی زبان کی تعلیم اور فقہ و حدیث کے درس کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا اور جو لوگ ان علوم کو حاصل کرتے وہ حقیر خیال کیے جاتے۔ علوم دینی کے بجائے حکمت و فلسفہ ریاضی و تاریخ اور اسی نوع کے علوم کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ زبان میں ہندویت پیدا کرنے کی طرف خاص میلان تھا اور عربی حروف کو زبان سے خارج کرنے کی بھی تجویزیں تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے دینی مدرسے ویران ہونے لگے اور اکثر اہل علم ملک چھوڑ کر نکلنے لگے۔

یہ تو تھا حکومت کا حال۔ اور عوام کا حال یہ تھا کہ جو لوگ باہر سے آئے تھے وہ ایران و خراسان کی اخلاقی و اعتقادی بیماریاں ساتھ لائے تھے اور جو لوگ ہندوستان ہی میں مسلمان ہوئے تھے انکی اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا اس لیے وہ برائی جاہلیت کی بہت سی باتیں اپنے خیالات اور اپنی عملی زندگی میں لیے ہوئے تھے۔ ان دونوں قسم کے مسلمانوں نے مل جل کر ایک عجیب مرکب تیار کیا تھا جس کا نام ”اسلامی تمدن“ تھا۔ اس میں شرک بھی تھا، نسلی اور طبقاتی امتیازات بھی تھے،

اولیام و عرفات بھی تھے، اور نوایجاد رسموں کی ایک نئی شریعت بھی تھی۔ دنیا پرست علماء و مشائخ نے نہ صرف اس مخلوطہ سے موافقت کر لی تھی، بلکہ وہ اس نئے مسک پروہت بنگئے تھے۔ لوگوں کی طرف سے انکو نذرانے پہنچتے، اور انکی طرف سے لوگوں کو فرقہ بندی کا تحفہ ملتا۔

Stoicism

پیرانِ طریقت کے ہاتھوں سے ایک اور بیماری پھیل رہی تھی۔ اشراقیت، ارواقیت اور ویدانتزم کی آمیزش سے ایک عجیب م کا فلسفیانہ تصوف پیدا ہو گیا تھا جسے اسلام کے نظام اعتقادی و اخلاقی میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ طریقت و حقیقت، اشراق اسلامی سے الگ اور اس کے بے نیاز قرار دی گئی تھیں۔ باطن کا کوچہ ظاہر سے جدا بنا لیا گیا تھا اور اس کو چھ کا قانون یہ تھا کہ حدودِ حلال و حرام رخصت، احکام دین عملاً منسوخ، اور ہونے نفس کے ہاتھ میں کئی اختیارات، جس فرض کو چاہے ساقط کرے اور جس چیز کو چاہے فرض بلکہ فرض الفرض بنا دے، جس حلال کو چاہے حرام کر دے اور جس حرام کو چاہے حلال کر دے۔ ان عام بیروں بہتر جنگی حالت تھی ان پر بھی کم و بیش اس فلسفیانہ تصوف کے اثرات پڑے ہوئے تھے، اور وحدت الوجود کے ایک غلط تصور خصوصیت کے ساتھ تمام قواعد کو بیکار کر دیا تھا۔ یہ حالات تھے جب اکبری سلطنت کے ابتدائی ایام میں شیخ احمد سرہندی پیدا ہوئے۔ انکی تعلیم و تربیت ایسے لوگوں میں ہوئی تھی جو اس دورِ صلاح ترین لوگ تھے، گو اپنے گرد و پیش کے فساد کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے مگر کم از کم اپنے ایمان و عمل کو بچائے ہوئے تھے، اور جہاں تک ہو سکتا تھا دوسروں کی اصلاح بھی کر رہے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ کو سب سے زیادہ فیض حضرت باقی باللہ صاحبؒ پہنچا جو اپنے وقت کے ایک بڑے صلاح بزرگ تھے۔ مگر خود شیخ کی ذاتی صلاحیتوں کا حال تھا کہ جب حضرت موصوف کے ساتھ راہِ درسم کی ابتدا ہوئی تھی اسی وقت انہوں نے شیخ کے متعلق اپنے یہ خیالات ایک دوست کو لکھ کر بھیجے تھے کہ:

سہ پیدائش ۹۷۱ھ - وفات ۱۰۳۷ھ - ۱۶۶۳ء

”حال میں سرہند سے ایک شخص شیخ احمد نامی آیا ہے۔ نہایت ذی علم ہے۔ بڑی علمی طاقت رکھتا ہے۔ چند روز فقیر کے ساتھ اسکی نشست و برخاست ہوئی ہے۔ اس دوران میں اُس کے حالات کا جو مشاہدہ ہوا اُسکی بنا پر توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ایک چمرغ ہوگا جو دنیا کو روشن کر دیگا۔“

یہ پیشینگوئی پوری ہوئی۔ ہندوستان کے گوشوں میں بہت سی حق پرست علماء اور سچے صوفیہ بھی اُس وقت موجود تھے، مگر ان سب کے درمیان وہ اکیلا شخص تھا جو وقت کے ان فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدی کی حمایت کے لیے اٹھا اور جس نے شاہی قوت کے مقابلہ میں یکہ و تنہا احیاء دین کی جدوجہد کی۔ اس بے سرو سامان فقیر نے علی الاعلان اٹھ کر ان گراہیوں کی مخالفت کی جنہیں حکومت کی حمایت حاصل تھی، اور اُس شریعت کی تائید کی جو حکومت کی نگاہ میں مبغوض تھی۔ حکومت اس کو ہر طرح دبانے کی کوشش کی حتیٰ کہ جیل بھی بھیجا، مگر بالآخر وہ فتنہ کامنہ پھیر دینے میں کامیاب ہو گیا۔ جہانگیر جس نے سجدہ تہیت نہ کرنے پر شیخ کو گواہی کے قید خانے میں بھیج دیا تھا، آخر میں شیخ کا معتقد ہو گیا اور اپنے بیٹے خرم کو، جو بعد میں شاہجہاں کے لقب سے تخت نشین ہوا، اُنکے حلقہ بیعت میں داخل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے متعلق حکومت کی معاذانہ روش احترام سے بدل گئی۔ ”دین الہی اکبر شامی“ ان تمام بدعتوں کے ساتھ ختم ہوا جو درباری شریعت سازوں نے گھڑی تھیں۔ اسلامی احکام کی جو ترمیم و تنسیخ کی گئی تھی وہ خود منسوخ ہو گئی۔ حکومت اگرچہ شاہی حکومت ہی رہی، مگر کم از کم اتنا ہوا کہ علوم دینی اور احکام شرعی کی طرف اُس کا رویہ کافرانہ ہونے کے بجائے عقیدت مندانہ ہو گیا۔ شیخ کی وفات کے تین چار ہی سال بعد عالمگیر پیدا ہوا اور غالباً وہ شیخ ہی کے پھیلا ہوئے اصلاحی اثرات تھے جنکی بدولت تیسویں خاندان کے اُس شاہزادے کو وہ علمی اور اخلاقی تربیت مل سکی کہ اکبر جیسے ہادیم شریعت کا پر پوتا ناخاک شریعت ہوا۔

شیخ کا کارنامہ اتنا ہی نہیں ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں حکومت کو بالکل ہی کفر کی گود میں